یہ لشکرِ بے اماں

عرفان صدیقی

تازہ لہو کے تازہ جام پینے کے بعد ''عہدِ خوں رنگ'' کا چہرہ کچھ اور نکھر آیا ہے۔ جوانانِ قوم کے خونِ گرم کی حدت سے اس کے رخسار تمتمانے لگے ہیں۔ بلاشبہ یہ تاریخ ساز کامیابی ہے، لال قلعہ تو نا آسودہ خواہشوں کی دھند میں کھو گیا، لیکن لال مسجد کے میناروں پر کامرانی کے پرچم لہرا دیے گئے۔ لاریب، یہ ایک ''تاریخ ساز فتح'' ہے۔ کوئی بھی سپاہ اس پر ناز کرسکتی ہے۔ یہاں ایک سو سال تک سات سمندر پار سے آئے سامراج کی حکمرانی رہی، لیکن وہ بھی اپنے غلاموں پر ایسی عظیم فتح نہ پاسکا۔ شاید دنیا کی تاریخ میں ایسی کامرانی کی کوئی نظیر نہ ملے، شاید ہی کسی ریاست نے کسی تعلیمی ادارے کو اس انداز سے فتح کیا ہو۔ شاید ہی کسی حکومت نے کسی درس گاہ پر حملہ کرکے اتنے لوگوں کا خون بہایا ہو۔

میں منگل کے دن، پاکستانی وقت کے مطابق کوئی سات بجے شام بوسٹن کے ریلوے اسٹیشن سے مانچسٹر جانے والی ٹرین پر سوار ہوا۔ بہ مشکل اپنی نشست سنبھالی تھی کہ لندن سے ایک دوست نے اطلاع دی ''مولانا عبدالرشید غازی شہید ہوگئے ہیں۔'' ایک تیز دھار خنجر میرے دل میں دور تک اتر گیا۔ ذرا دیر بعد فون کی گھنٹی پھر بجی۔ اسلام آباد سے کسی نے خبر کی تصدیق کی۔ میرے اعصاب میری گرفت میں نہ رہے۔ سر آپ ہی آپ نشست سے جا لگا۔ آنکھوں میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ میں نے ضبط کی تمام تر قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے آنسوؤں پر قابو رکھا، لیکن اندر ہی اندر ایسا ساون برسا کہ میری روح تک جل تھل ہوگئی۔ تیز رفتار ٹرین فراٹے بھر رہی تھی۔ میں ٹیک لگائے شیشے سے باہر جھانک رہا تھا۔ بادلوں سے ڈھکا آسمان سرسبز میدان، ہرے بھرے کھیت، شاداب چراگاہیں، آزادانہ گھومتے مال مویشی، کسانوں کے روایتی گھر۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور جامعہ حفصہ کے ایک چھوٹے سے کمرے میں عبدالرشید غازی میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ بڑی محبت سے چائے بنا رہا تھا۔ اصرار کے ساتھ مجھے بسکٹ پیش کر رہا تھا۔ مولانا عبدالعزیز مجھے اپنا نقطۂ نظر سمجھا رہے تھے۔ میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے غازی سے کہا ''آپ بھی تو کچھ بولیں'' اس نے مسکراتے ہوئے ادب واحترام کے گندھے لہجے میں کہا تھا ''دو بڑوں کے سامنے میں کیا بولوں؟''

مجھے دکھ ہوا کہ میری بات نہیں مانی گئی۔ پھر میں اس قضیے سے الگ ہوگیا۔ میں نے اس پر بہت کچھ لکھنے سے بھی گریز کیا۔ میرے دل کے کسی دور دراز گوشے میں یہ خدشہ کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا کہ کوئی انہونی ان دونوں بھائیوں کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ میں نے ملاقات والے چھوٹے سے کمرے میں خونِ شہدا کی خوشبو جیسی مہک بھی محسوس کی تھی۔ شاید عبدالرشید غازی کا خیال ہو کہ اسلام آباد کا شہر خوش جمال باجوڑ اور ڈمہ ڈولہ جیسی بے آب ورنگ بستیوں سے بہت

مختلف ہے۔ یہاں دارالحکومت کے عین قلب شہر میں خون کی ہولی کھیلنا آسان نہیں ہوگا۔ شاید وہ بھول گیا تھا کہ سفا کی تہذیب کے کسی قرینے کو نہیں مانتی۔ رعونت اپنے ضابطے خود بناتی ہے، طاقت کا نشہ، آئین وقانون کے تقاضوں سے ماورا ہوتا ہے۔ درندگی، اخلاقیات کا کوئی پیمانہ نہیں رکھتی اور فتح وکامرانی کا جنون، انسانیت کے آداب سے بیگانہ ہوتا ہے۔ خناس، احساس سے عاری ہوتا ہے۔ مولانا عبدالعزیز کی گرفتاری کے بعد انہیں ایک بار پھر برقعہ پہنا کر پی ٹی وی نے جو ڈرامہ تخلیق کیا اس کے تصور سے بھی گھن آتی ہے۔ اس ڈرامے کا ہدایت کار جو بھی تھا، کم از کم یہ واضح ہوگیا کہ حکمران، حکمت سے عاری ہی نہیں، ایک عالم دین کی تضحیک وتوہین کا نشانہ بنا کر لطف اٹھا رہے ہیں۔

مجھے تھوڑی دیر پہلے، مولانا فضل الرحمن خلیل کا فون آیا، عبدالرشید غازی کی خواہش پر انہیں شریک مذاکرات کیا گیا تھا۔ وہ گھنٹوں معاملہ سلجھانے کے لیے کوشاں رہے۔ فضل الرحمن خلیل نے بتایا کہ ''منگل کو عبدالرشید غازی سے میری آخری بات ہوئی وہ کہہ رہے تھے..... اس وقت میری والدہ کا سر میری گود میں رکھا ہے۔ وہ کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے آخری ہچکیاں لے رہی ہیں۔ ان کی روح پرواز کرنے کو ہے۔ مجھے بھی شہادت صاف دکھائی دے رہی ہے۔ میری وصیت ہے کہ مجھے میرے شہید والد کے پہلو میں دفن کیا جائے۔

میری والدہ..... ''پھر غازی کی سسکیوں کی آواز سنائی دی اور فون بند ہوگیا۔''

شہید شوہر کی، شہید اہلیہ نے چند لمحوں بعد شہید ہونے والے بیٹے کے زانو پر سر رکھے، رکھے آخری ہچکی لی۔ معلوم نہیں غازی کا سینہ کس وقت چھلنی ہوا۔ معلوم نہیں آخری ہچکی لیتے ہوئے اس کا سر کس کے زانو پر دھرا تھا۔

مولانا فضل الرحمن خلیل مجھ سے کہہ رہے تھے ''اعجاز الحق تمہارا دوست ہے۔ خدا کے لیے اسے کہو کہ غازی کی میت ہمارے حوالے کردیں۔ یہ لوگ اسے زبردستی روجھان مزاری لے جانا چاہتے ہیں۔ اس کی بیوی، اس کی بہنیں دہائی دے رہی ہیں، شہید کی آخری وصیت تو پوری ہونے دیں۔''

میں نے اعجاز الحق کے تمام معلوم نمبروں پر رابطے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ بات ہو بھی جاتی تو وہ کیا کرلیتا؟ یہاں تو 342 ارکان کی پارلیمنٹ اور 80 وزرا کی جہازی کابینہ ہوتے ہوئے بھی فیصلے فرد واحد کے کنج لب سے پھوٹ رہے ہیں۔

سرینڈر پوائنٹ بنانے، ہتھیار ڈلوانے، ہاتھ اٹھا کر مارچ کرانے کی خواہش بیمار آسودہ ہوگئی ہے۔ بے چہرہ بندوبست کے سیاہ کارناموں کی کتاب سیاہ میں سب سے شرمناک باب کا اضافہ ہوگیا۔ فتح مندی کا جنوں بھر نہ جاتا تو اس قتل عام کو روکا جاسکتا تھا۔ پرلے درجے کی بے حکمتی اور خودسری معاملات کو ایسے موڑ پر لے آئی جہاں تناؤ بڑھتا ہی چلا گیا۔

صدر مشرف اور ان کے رفقا ابتدا ہی سے لال مسجد والوں کو نمونہ عبرت بنانے پر بضد تھے۔ کابینہ کے دو وزرا، ان کی خوشنودی کے لیے ہاں میں ہاں ملا رہے تھے، جس کسی نے صلح صفائی کی بات کی اس نکو بنا دیا گیا۔ سلجھاؤ کی کوششوں کو مخلصانہ ریاستی سرپرستی حاصل ہی نہ ہوسکی۔

صدر بلوچستان کے سیلاب زدگان کو تسلی دینے گئے اور کمانڈو کی وردی پہن کر اعلان کیا ''یہ مارے جائیں گے..... یہ مارے جائیں گے۔'' انہوں نے ایسا ہی ایک اعلان نواب اکبر بگٹی کے بارے میں کیا تھا، ''یہ لوگ اس طرح مارے جائیں گے کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کس شے نے ہٹ کیا۔'' پھر بگٹی پہاڑ کے ایک غار میں بھسم ہو گیا۔ چودھری شجاعت نہ بگٹی کو بچا سکے، نہ غازی کو۔ کوئی نواب ہو کہ مولوی، غار نشیں ہو کہ حجرہ نشیں، رعونت کی طاقت آزمائی کسی کو معاف نہیں کرتی۔ یہ وہی حکمتِ عملی ہے، جسے ٹکہ خان نے مشرقی پاکستان میں آزمایا تھا اور جو اندھی، گونگی اور بہری قوتیں اپنی رعایا سے روا رکھتی ہیں۔

کہا گیا ''غازی آئین اور قانون کا مجرم تھا، اسے کس طرح راستہ دیتے؟'' کون سا آئین اور کیسا قانون؟ اور پھر مولانا فضل الرحمن خلیل اور دیگر علما کی مساعی سے جب ایک مفاہمت طے پا گئی تھی، وزرا کی مذاکراتی ٹیم اور وزیر اعظم نے اس کی توثیق کر دی تھی، تو صدر نے اسے کیوں ویٹو کر دیا؟ مجھے فضل الرحمن خلیل صاحب ہی نے بتایا کہ سب کچھ طے پا گیا تھا، لیکن پنڈی کیمپ آفس جانے والوں نے تین گھنٹے لگا دیے اور پھر واپس آئے تو ان کی جیبیں بارود سے بھری ہوئی تھیں۔

ضیاء الحق کے دور میں الذوالفقار نے پاکستانی طیارہ اغوا کر کے کابل پہنچا دیا۔ اغوا کاروں نے ایک سابق فوجی افسر کو قتل بھی کر دیا۔ انہوں نے سو کے لگ بھگ دہشت گردوں کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا، جو قتل و غارت گری اور غداری جیسے سنگین مقدمات میں ملوث تھے۔ ضیاء الحق نے مسافروں کی جانیں بچانے کے لیے ان سب کو رہا کر کے ہائی جیکرز کے مطالبے کے مطابق دمشق پہنچا دیا۔ بھارت کا طیارہ اغوا کر کے قندھار پہنچا دیا گیا۔ ہائی جیکرز نے بھارتی جیلوں میں بند کچھ ایسے قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا، جو بھارت کے مطابق سنگین ''جرائم'' میں ملوث تھے۔ آخر ہمارے حکمران سینکڑوں افراد کی جانیں بچانے کے لیے عبدالرشید غازی کو محفوظ راستہ دینے پر کیوں آمادہ نہ تھے؟

اس خون خواری و خون ریزی سے گریز ممکن تھا۔ لیکن ریاست نے اپنی رٹ قائم کر لی، درست کہ عبدالرشید غازی کے بعد پاکستان زیادہ محفوظ و مامون ہو گیا، برحق کہ فوج نے اپنی طاقت کا لوہا منوا لیا۔ لیکن کیا ''روشن خیالی'' اسی کا نام ہے؟ کیا مہذب ریاستیں یہی کچھ کیا کرتی ہیں؟ اگر امریکا کو یہ پیغام دینا مقصود تھا کہ ''دہشت گردی'' کا خاتمہ صرف میرے قوتِ بازو ہی سے ممکن ہے اور اس قوتِ بازو کا انحصار میری وردی پر ہے تو یہ پیغام صاف اور بلند آہنگ میں پہنچ گیا۔ اس کی تصدیق بھی ہو گئی اور تائید بھی۔ داد بھی مل گئی، لیکن جابروں کے قبیلے میں کوئی ہے، جو بتا سکے کہ اس سے پاکستان کے سینے پر کتنا گہرا گھاؤ آیا ہے؟ کسی کو خبر ہے کہ جب بوڑھی ماؤں کی لاشیں اپنے بیٹوں کی گود میں گرتی ہیں، تو اللہ کا عرش بھی لرز جاتا ہے۔

کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ بپھری ہوئی رعونت اور اندھی طاقت آزمائی، نفرتوں کو ہوا دیتی ہے اور ہر موجِ خوں وطن کی سرزمین میں ایک گہری دراڑ ڈال دی جاتی ہے؟

کسی دشمن سرزمین پر فاتحانہ آپریشن کے سے انداز میں لشکر کشی کی فنی جزئیات پر روشنی ڈالنے حد کوئی

ترجمان یہ بتانے پر تیار نہیں کہ جامعہ حفصہ اور لال مسجد کے صحن، برآمدوں، کمروں، راہداریوں میں کتنی لاشیں بکھری پڑی ہیں؟ کوئی نہیں جانتا کہ مقتولین کے ماں، باپ بھائی، بہن کہاں ہیں اور کس کرب کی آگ میں جل رہے ہیں؟ کوئی نہیں جانتا کہ آپریشن ''سائلنس'' کی کوکھ سے کتنی قباحتیں جنم لیں گی؟ بس اتنی خبر ہے کہ وائٹ ہاؤس نے اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ عینی شاہد کی طرح تمام تر ذمہ داری مسجد انتظامیہ پر ڈال دی ہے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو نے اس قتلِ عام کی ستائش کی ہے اور لندن میں بیٹھے ہوئے الطاف حسین نے اس کارنامے کو سراہا ہے۔ نائن الیون کا آسیب بھی کتنا بڑا ''دیوتا'' بن گیا ہے۔

پانچ چھ دن قبل مجھے اسلام آباد سے بیگم کا فون آیا۔ وہ بتانے لگیں ''غازی صاحب کی بہن کا فون آیا ہے، وہ رو رہی تھیں اور آپ کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ ان سے کہیں کچھ کریں۔'' میں اس رات سو نہیں پایا تھا۔ میں پاکستان میں ہوتا بھی تو کیا کر لیتا؟ فتح و کامرانی کے پھریرے لہراتا لشکر بے اماں، کیڑے مکوڑوں کو خاطر میں نہیں لایا کرتا۔

شہید باپ اور شہید ماں کا شہید بیٹا، ہمارے لفظوں کی مینا کاری سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ اللہ اس کی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔ اس کی خطائیں معاف کر دے۔ اس کے درجات بلند کرے اور ان سب کے بھی جو اس عہد خون رنگ کے خوں آشامی کا لقمہ ہو گئے۔

مولانا فضل الرحمن خلیل شاید اب تک نہیں جان پائے کہ ان کا سابقہ کن بے رحم موسموں سے آ پڑا ہے۔ اپنی پسند کے نشانے تلاش کرنے، اپنی مرضی کے سینے چھلنی کرنے، اپنے دل پسند تابوتوں میں بند کرنے، اپنی پسند کی قبروں میں پھینکنے اور اپنی مرضی کے جنازے پڑھوانے والوں کے سینے میں دل نہیں ہوا کرتے.....!!

☆☆☆

جامعہ حفصہ میں داخل ہوتے ہیں تو اس کے مرکزی دروازے باب عائشہ کے اوپر ایک بورڈ نصب ہے، جس پر مسلمان عورتوں کی دنیا میں سب سے بڑی درس گاہ کے الفاظ درج تھے۔ ذرائع ابلاغ کو وہ جگہ دکھائی گئی، جہاں کرنل ہارون اسلام ایک مشن کی قیادت کرتے ہوئے گولی کا نشانہ بنے تھے۔ اس تہہ خانے کی نشان دہی کی گئی، جہاں مولانا عبدالرشید غازی نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ مولانا غازی کا سینہ ایک گولی نے چیرا، جس نے ان کے جسم و روح کے رشتے کو توڑ ڈالا ان کے جسم پر کئی گولیاں لگیں، جس کی وجہ سے ان کی ایک ٹانگ ان کے جسم سے الگ ہو گئی۔

مولانا عبدالرشید غازی نے اپنے آخری دنوں میں کہا تھا کہ انتظامیہ ان کی موت کے بعد بتائے گی کہ مولانا غازی کے پاس ایٹم بم بھی تھا۔ اب یہ بات درست ثابت ہو رہی ہے کہ حکومت ان کے اور مدرسے کے طلبا کے خلاف جو الزامات عائد کر رہی ہے، انہیں چیلنج کرنے والا کوئی نہیں۔ ان طلبا کو مزاحمت کار اور جنگجو کا نام دیا جا رہا ہے۔ مسلح افواج کے شعبہ تعلقات عامہ کے وحید ارشد کی تفصیلی بریفنگ کے باوجود متعدد سوالات اٹھائے جاتے رہیں گے، جاں بحق ہونے والوں کی تلاش لاینحل سوال رہے گی۔ غیر ملکی عناصر کی موجودگی سربستہ راز ہی رہے گی۔ (رپورٹ)